شہزاد احمد کی غیر مدوّن نثری تحریریں :تحقیقی و تنقیدی جائزہ

[1] اسد عباس عابد

Abstract:

Shehzad Ahmad (1936-2012)has been counted as to be one of renowned poet of modern Urdu ghazal. He was vastly read person whose domain was much larger than just poetry. He wrote thirty-two books on the topic of science, philosophy and Islam. He acclaimed a great fame in field of science. Translation, light essay and reviewer. this research article is an endeavor to bring forth the unedited prose writings of Shehzad Ahmad namely his articles, light essays and interviews. which will help a great deal to understand his intellectual ideas.

Keywords: Unedited, Prose writing, Revolt from tradition, Enriched Ghazal, Ethical values.

شہزاد احمد(۱۹۳۶ء-۲۰۱۲ء)کا شمار بلا تامل جدید اردو غزل کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخصیت تھے جن کا علمی و فکری دائرہ محض شاعری سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ اُنھوں نے سائنس، فلسفہ، نفسیات اور اسلام کے موضوع پر بتیس کتب تحریر کیں۔ اُنھیں بطور سائنسی مضمون نگار، مترجم، انشائیہ نگار اور تبصرہ نگار بہت شہرت ملی۔ زیرِ نظر تحقیقی مضمون میں شہزاد احمد کے غیر مدون نثری تحریروں جن میں مضامین، انشائیے اور مصاحبے شامل ہیں، کو سامنے لانا ہے تاکہ شہزاد احمد کی فکر کی بہتر طور پر تفہیم ممکن ہو سکے۔

کلیدی الفاظ: غیر مدون، نثری تحریریں، روایت سے انحراف، زرخیز غزل، اخلاقی اقدار

شہزاداحمد (۱۶/اپریل۱۹۳۶ء۔ ۱/اگست ۲۰۱۲ء) کانام جدید غزل کے معماروں میں ایک معتبر اور قابلِ تحسین حوالہ ہے۔ قیام پاکستان کے فوراًبعد ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے بعد تیسرا اہم نام ہمیں شہزاداحمد کا ہی نظر آتا ہے، جنھوں نے جدید غزل کی صورت گری میں اہم کردارادا کیا ہے۔ یہ شہزاداحمد ہی تھے جنھوں نے غزل جیسی لطیف اور نفیس صنفِ سخن کو نظمیاتی آہنگ سے بچانے میں نمایاں حصہ کردارادا کیا۔ جہاں مقتل، غزالاں، صلیب، تیر نیم کش، اور قفس جیسے استعارے غزل کی شائستہ تہذیب میں باندھے جارہے تھے وہاں اُنھوں نے لمحہ موجود میں پائی جانے والی اشیاء سے مستفید ہونے کی طرف اشارہ کیا۔اس پورے عمل کی گواہ اُن کی غزلیں ہیں، بطور خاص اُن کے پہلے دو شعری مجموعے ''صدف''اور ''جلتی بجھتی آنکھیں''جو خالصتاًغزل کے مجموعے ہیں۔ بعد میں بہت سے شعرا نے شہزاداحمد کی اس روش کواختیار کر کے جدید شاعر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ شہزاداحمد کی غزل ایک پڑھے لکھے اور منفرد قاری کی غزل ہے اور یہ غزل خود بھی بہت پڑھی لکھی نظر آتی ہے، جس میں جدید علوم کی آمیزش ہے۔ایسی غزل کے پس منظر میں کئی مغربی مفکروں کی ادبی

۱ پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو و مشرقی زبانیں، یونی ورسٹی آف سرگودھا

تھیوریوں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ اس غزل کے موضات میں جس قدر ندرت، جدت اور لطافت ہے وہ شہزاد احمد کے مطالعے اور ریاضت کی مشترک میراث ہے، بلکہ اُنھوں نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

''میں نے ایک بار کہا تھا کہ جب تک میں زندہ ہوں غزل مر نہیں سکتی''[1]

شہزاد احمد کے وسیع المطالعہ ہونے کی گواہ صرف اُن کی غزل ہی نہیں بلکہ کچھ ایسے تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی ہیں جو اُنھوں نے لکھے ہیں۔ اُنھوں نے بہت سارے مضامین کو اپنی کتابوں میں شامل کیا ہے۔ شہزاد احمد نے شاعری کے علاوہ سائنس، فلسفہ، نفسیات، اسلام کے حوالے سے تقریباً بتیس کتابیں لکھی ہیں۔ اس مضمون میں اُن کے غیر مدون مضامین، انشائیے اور انٹرویوز سے اُن کے خیالات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شہزاد احمد کے علمی اثاثے کے بارے میں ایک واضح رجحان اُن کی شاعری ہی کو سمجھا جاتا ہے، مگر اُنھوں نے دیگر علمی ادبی موضوعات کی طرف قلم اٹھا کر خود کو علمی نثر نگاروں کی صف میں بھی لا کھڑا کیا ہے۔ سائنس، فلسفہ، ترجمہ نگاری، انشائیہ اور تبصرہ نگاری بھی اُن کی ادبی جہات میں شامل ہے۔

تنقیدی اور تحقیقی موضوعات پر لکھتے وقت وہ اپنی بات کا تعارف بہت شائستگی اور روانی سے کراتے ہیں جس وجہ سے ایک قاری جو ادب کے مخصوص موضوعات کو پڑھنے کا عادی ہوتا ہے اچانک سائنس، فلسفہ اور نفسیات کی توجیہات سے آشنا ہونے لگتا ہے۔ اس عمل سے شہزاد احمد بھی اپنی بات کی رمزیات کو واضح کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں یوں سمجھیں یہ اُن کا ایک کامیاب کھلاڑی کی طرح منفرد انداز ہے۔ شہزاد احمد کے تنقیدی اسلوب کی یہ خوبی تو ہے ہی مگر اس میں ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اس تیاری میں قاری پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مغربی ادب کا مطالعہ شہزاد احمد کا پسندیدہ مشغلہ ہے فلسفہ اور نفسیات کے وہ باقاعدہ طالب علم تھے۔ اپنی تھکن اور بوریت ختم کرنے کے لیے وہ فزکس اور کیمسٹری کا مطالعہ کرتے تھے۔ ایسے شخص کی غزل موضوعات کی فراوانی سے کیسے تہی ہو سکتی ہے یا ایسے شخص کی گفت گو کیسے دلیل کے بنا ہو سکتی ہے۔

اس پر ایک اہم بات کہ وہ نثر اور شعر کی زبان میں بڑا فرق رکھتے ہیں۔ علمی نثر نگاری میں ایسا رواں اسلوب ہے کہ اُن کے سائنسی موضوعات، نفسیاتی اور فلسفیانہ موضوعات قابل فہم اور Read able ہیں۔ مغربی تھیوریوں اور اصطلاحات کو پیش کرنے میں وہ ادب اور سائنس کے درمیان رہتے ہیں۔

شہزاد احمد نے جہاں بہت زرخیز غزل لکھی ہے وہاں اُن کا شمار غزل کے نقادوں میں بھی ہونا چاہیے۔ اس خوابیدہ پہلو کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ غزل پر تنقید کے حوالے سے اُن کا ایک نقطہ نظر تو یہ ہے کہ غزل صرف قافیہ ردیف کی مطابقت کا نام نہیں بلکہ غزل میں مقصدیت ہونے چاہیے۔ یہاں وہ موضوعات کی اہمیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''کچھ لوگ فرمائشی پروگرام اور ریڈیو سیلون سن کے موسیقار بننا چاہتے ہیں اور کچھ محض مشاعرے سن کر غزل کہنے کے شوقین ہیں۔ اُن کی غزل گوئی کا مطمعِ نظر شاعری نہیں مشاعرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا مقصد یا مقصدیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''[۲]

شہزاد احمد جہاں غزل میں مقصدیت کے حوالے سے بات کرتے ہیں وہاں وہ غزل کی مسلسل ایک جیسی روایت سے بھی انحراف کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ غزل میں رجحانات کی تبدیلی سے اس میں جدت پیدا کی جاسکتی ہے۔ غزل کو جس باعث نیم وحشی صنفِ سخن کہا گیا اُن کے نزدیک وہ موضوعات کی یکسانیت ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اس صنفِ سخن کے اندر رجحانات پیدا کیے جائیں تا کہ غزل کی کائنات آنے والے زمانوں میں قابلِ رشک رہے۔ ایک مضمون میں کہتے ہیں:

> ''ایک طرف تو میں غزل دشمنی میں ہم نوائی کر چکا ہوں اور دوسری طرف خود ہی غزل کی حمایت بھی کی ہے۔ دراصل یہ مخالفت غزل کے اندر اُن رجحانات کی مخالفت ہے جو غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن یا ریزہ سرائی بنا رہے ہیں۔ غزل بطور شاعری کے نہ کبھی بری تھی اور نہ ہے۔''[۳]

شہزاد احمد نے غزل کی تنقید میں غالب، اقبال، یگانہ، نظیر اکبر آبادی، ناصر کاظمی اور ظفر اقبال کو بطور خاص دیکھا ہے۔ اُن کے نزدیک قیامِ پاکستان کے بعد کی غزل ہی جدید غزل ہے۔ اُنھوں نے غزل کی تنقید کی بنیاد زیادہ طور پر اسی جدید غزل پر رکھی ہے، غالب اور اقبال کی شاعری سے وہ بطور خاص متاثر نظر آتے ہیں۔

غالب، اقبال، یگانہ، نظیر اکبر آبادی، اور ظفر اقبال کے بارے میں اُنھوں نے اپنے مضامین ''غزل یا نظم''، ''اردو غزل کے جدید تر رجحانات''، ''غزل اور ردِ غزل'' میں کئی مقامات پر بات کی ہے۔ جدید غزل میں جو رجحانات سامنے آتے ہیں شہزاد احمد نے اس کی بہتر تفہیم کے لیے موضوعاتی اور شخصی سطح پر درجہ بندی کی ہے۔ کچھ رجحانات ایسے تھے جنھوں نے بہت سے شعرا کو اپنے تابع کیا اور کچھ شعرا ایسے تھے، جنھوں نے بہت سے نظریات کو عام کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ جدید غزل کے اندر پہلا ردِ عمل قیام پاکستان کے بعد کی صورتِ حال سے جنم لیتا ہے، کہ جب ہجرت کے ممکنہ نتائج سامنے نہ آئے تو شعرا کی ایک کثیر جماعت نے اظہارِ تاسف کیا۔ ایسی کھیپ میں خود شہزاد احمد کا بھی شمار ہوتا ہے:

پھرتے پھرتے، خاک اُڑاتے، کس ویرانے میں پہنچے
یہ کیسا جنگل ہے جس میں جن مبہوت، آدم خاموش
[''جلتی بجھتی آنکھیں''، ص ۹۰]

جو گھر بنائے تھے سب ریت کے محل نکلے
سروں پہ کچھ نہ رہا، نیلے آسماں کے سوا
[''خالی آسمان''، ص ۱۰۲]

قیام پاکستان کے بعد اردو غزل جن جن رجحانات سے متاثر ہوئی ہے شہزاد احمد کی غزل بھی خود اس کا بہت مضبوط حوالہ ہے، کیوں کہ قیام پاکستان کے بعد کی غزل میں شہزاد احمد ایک نمایاں شاعر ہیں۔ آزادی کے ثمرات حاصل نہ ہونے پر کچھ ذہن واہمہ شکنی کا شکار ہو گئے، مغربی دنیا میں اس وقت کچھ ایسے تصورات جنم لے رہے تھے جو باشعور لوگوں کو اپنی طرف شدت سے کھینچ رہے تھے۔ معاشرہ بھی اخلاقی اقدار سے عاری ہو چکا تھا، تشکیک کے رویے پنپ رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں جو غزل لکھی گئی وہ آج بھی جدید غزل کی روایت میں اپنے مخصوص استعاروں اور لفظیات سے پہچانی جاتی ہے۔

جدید غزل پر تنقید کے حوالے سے شہزاد احمد کے نزدیک دوسرا ردِ عمل غزل کے اندر معاشرتی اور سیاسی شعور ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے سیاسی حالات نے عام آدمی کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے،

کیوں کہ جب لوگ ایک سنہرے کل کی امید لے کر ایک لگا بندھا نظامِ زندگی چھوڑ کر سنہرے مستقبل کی امیدیں دل میں بسائے نکل پڑے۔ تقسیم کے بعد کے سیاسی اور معاشرتی حالات نے لوگوں کے سخت مایوس کیا۔اس رویے کے اسباب کئی راستوں سے انسانی زندگی میں داخل ہوئے اور غزل میں اس کی نمائندگی مخصوص استعاروں اور تشبیہات نے کی ہے۔ یہ ایسی صورتِ حال تھی جس کے اظہار میں غزل اور نظم کے مواد کی تفریق بھی ختم ہوتی نظر آتی ہے اظہار کی شدت موضوع کی قائل نظر آنے لگتی ہے۔ شہزاد احمد کے نزدیک جدید غزل کی روایت میں یہ دوسرا بڑا اہم ردِ عمل ہے جسے بڑے واضح انداز میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شہزاد احمد نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''جدید غزل اپنے مزاج کے لحاظ سے ایک ایسا رویہ ہے، جو فرد کی شکست وریخت کو اہمیت دیتا ہے اور کسی قسم کے مربوط نظامِ فکر کی پابندی قبول نہیں کرتا۔''[۴]

کلاسیکی غزل ہو یا جدید غزل اس میں کچھ ردِ عمل ایسے ہیں جن کی وجہ کچھ شاعر ہیں، ان شعرا میں غالب، یگانہ، اقبال، نظیر اکبر آبادی اور ظفر اقبال ہیں۔ شہزاد احمد کے ہاں جدید غزل کے ساتھ ساتھ کلاسیکی غزل کے مزاج پر کہیں کہیں کچھ تنقیدی نوٹس بھی ملتے ہیں۔

وہ لوگ جو کلاسیکی غزل کو من و عن قبول کرنے کے عادی ہیں شہزاد حمد نے ایسی غزل کو ''جاگیرداری روایت'' کہا ہے۔ کلاسیکی دور میں جاگیرداری غالب رہی ہے۔ وارث شاہ نے ہیر وارث شاہ لکھ کر عورتوں کے حقوق کی بات کی ہے مگر اس سے پہلے عورتوں کو اُن کے حقوق سے دور ہی رکھا گیا ہے۔ یہ سلسلہ کلاسیکی دور کی غزل میں شعوری اور غیر شعوری طور پر ملتا ہے جس میں عاشق بہت فعال ہے اور محبوب محض مجبور و بے بس نظر آتا ہے۔ کلاسیکی دور کی غزل کے تمام کرداروں کے مجموعی رویے جاگیردارانہ نظامِ اقدار کی غمازی کرتے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ نہ کچھ ردِ عمل ملتا ہے مگر مغلوں کے دور تک غزل پر جاگیرداری کی چھاپ نظر آتی ہے۔ شہزاد احمد کے نزدیک جو لوگ غزل کو کلاسیکی روپ میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں وہ دراصل اسی مخصوص ذہن کی عکاسی کرتے ہیں۔اس کے بعد غزل نے ایرانی تہذیب کی اقدار کا بھی تتبع کیا ہے یہ تہذیب اتنی تہہ دار تھی کہ اسے کماحقہ قبول کرنا مشکل تھا لہذا تصوف کا پیرایہ اختیار کیا گیا۔

اردو اور فارسی غزل کے اس امتزاج سے غزل کا ایک مابعد الطبعیاتی نظام بھی سامنے آیا ہے جو اردو اور فارسی روایات کے بہت قریب ہے۔ غزل کی روایت تہذیبی سطح پر اتنی تہہ دار ہے کہ اس نے بہت سی تبدیلیوں کا قبول بھی کیا ہے اور رد بھی کیا ہے مگر اپنے مجموعی مزاج کو قائم رکھا ہے۔ غزل کا یہ مزاج غالب تک آکر اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ یہیں پر حالی جیسا تربیت یافتہ شاعر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس پیرائے میں توڑ پھوڑ کی جائے۔

کلاسیکی غزل کی اس روایت میں شہزاد احمد کے نزدیک پہلا ردِ عمل نظیر اکبر آبادی کے ہاں نظر آتا ہے۔ نظیر نے تہذیبی اقدار کو مابعد الطبعیات کے بغیر قبول کیا ہے۔ نظیر کے ہاں زندگی کی تصویر بہت سامنے کی تصویر ہے وہ مروجہ فلسفہ کو بہت کم قبول کرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کے بارے میں شہزاد احمد نے لکھا ہے کہ :

> ''نظیر صحیح معنوں میں اُردو شاعری کا ایسا ردِ عمل ہے جو بلندی کی طرف دیکھنے کی بجائے زمین کی طرف نظریں گاڑے ہوئے ہیں اور یوں مابعد الطبیعات کی جگہ عمومی حقیقت پسندی نے لے لی ہے۔ نظیر کا محبوب کلاسیکی غزل کی طرح سرد مہر نہیں ہے، بلکہ پورے شدومد کے ساتھ محبت کرتا ہے۔''[۵]

شہزاد احمد کے نزدیک کلاسیکی غزل کا دوسرا بڑا ردِ عمل اقبال ہے۔ اقبال ایک فلسفہ حیات کا قائل ہے کہ جس کے ہاں اسلامی عجمی روایت کے مروجہ مفہوم تبدیل ہوتے نظر آتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ کہ اقبال کے ہاں غزل اور نظم کی تفریق بھی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

> ''اقبال اس لحاظ سے بے حد اہمیت کے حامل ہیں کہ اُنھوں نے اپنا مابعد الطبعیاتی نظام تشکیل دیا تھا اور اُنھوں نے اُردو شاعری میں بالکل نئی جہتیں دریافت کی تھیں۔ اقبال ان معدودے چند شعرا میں سے ایک ہیں جو اپنا نظام خود بناتے ہیں اور پھر اُس کو مکمل بھی کر دیتے ہیں۔''[۶]

شہزاد احمد کے علامہ اقبال کی شاعری پر کئی مقامات پر کچھ نہ کچھ نوٹس ملتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ علامہ اقبال سے کئی جہتوں میں متاثر تھے۔ اس کی ایک مشترک کڑی یہ بھی ہے کہ شہزاد احمد خود بھی فلسفہ اور نفسیات کے طالب علم تھے اور علامہ اقبال کے ہاں بھی فلسفہ پایا جاتا ہے۔ شہزاد احمد ایک جگہ لکھتے ہیں :

''میں سمجھتا ہوں کہ وہ فلسفے کی کلاسیکی روایت کے آخری آدمی تھے۔اُن کے بعد فروعات کا ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے جواب تک رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔''[۷]

جدید غزل کی صورت گری میں اقبال نے ایک قابلِ ذکر کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اُنھوں نے نہ صرف روایت سے بغاوت کی بلکہ جدید غزل کو ایک نئے پیراڈایم سے متعارف بھی کروایا۔بقول شہزاد احمد:

''جدید غزل کے لیے صحیح معنوں میں امکانی میدان اقبال نے پیدا کیا تھا۔اقبال نے غزل کی روایات سے بغاوت کی، مگر یہ بغاوت محض ردِ عمل نہیں تھی۔بلکہ اقبال نے غزل میں کتنی نئی جہتیں بیدار کر دیں، بہت سے مابعد الطبعیاتی سوالات، معاشرتی مسائل اور سیاسی ردِ عمل اقبال کے باعث اس شعری ہیئت میں در آئے جسے ہم جدید غزل کہتے ہیں۔''[۸]

شہزاد احمد نے علامہ اقبال پر تنویر ظہور سے بات کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو[۹]میں بڑی اہم بات کی ہے کہ اقبال کے بغیر ترقی پسندوں کا وجود قابلِ قبول نہیں۔ڈاکٹر تاثیر اور سجاد ظہیر کی لندن میں ملاقات سے پہلے اقبال ترقی پسندی کو شروع کر چکے تھے اور اقبال نے انھیں موضوعات کو چھیڑا ہوا تھا جو بعد میں ترقی پسندوں کے موضوع بنے، مگر ترقی پسندوں کو ایسے شخص کو ساتھ لے کر چلنا مشکل تھا جو ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ اسلام کو نام بھی لیتا ہو۔

شہزاد احمد کی غزل پر تنقید کے سلسلہ میں تیسرا اہم ردِ عمل یگانہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔یگانہ ایک ایسا ردِ عمل تھا جس نے غزل کی مروجہ روایت اور اقدار کو شک کی نظر سے دیکھا۔یگانہ کے اس عمل نے غزل میں جدت تو پیدا کر دی مگر اپنے طور پر وہ کوئی مثبت قدر تخلیق کرنے سے قاصر رہا۔یگانہ کے ہاں غالب شکنی بھی صرف اور صرف اسی بات کی وجہ سے تھی کہ وہ اُس غزل سے جو اپنے مخصوص پس منظر کے ساتھ غالب تک آتے آتے اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی یگانہ اُس غزل سے منحرف تھا۔غالب کی شخصیت کے ساتھ یگانہ کا کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ غالبؔ کے ساتھ تو یگانہؔ تو صلح کرنا چاہتے تھے۔یگانہؔ کے اس عمل سے غزل کی روایت میں تشکیک کا رویہ سامنے آتا ہے جو غزل کی روایت میں شہزاد احمد کے نزدیک تیسرا بڑا رجحان ہے۔ایک مضمون میں شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> ''جدید غزل ۱۹۵۰ء کے قریب صورت پذیر ہوئی اور بنیادی طور پر نظیرا کبرآبادی اور یگانہ چنگیزی کے رویّوں کا اجتماع ہے۔ جدید غزل نے واہمہ شکنی کی روایت یگانہ چنگیزی سے اور سامنے کی چیزوں کی اہمیت نظیرا کبرآبادی سے سیکھی ہے۔''[۱۰]

غزل پر تنقید کے سلسلہ میں شہزاد احمد کے نزدیک چوتھا بڑا رجحان ہ میں غالب کی صورت میں ملتا ہے۔ غالب کے بارے میں شہزاد احمد خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالب کا عہد مجموعی طور پر تبدیلیوں کا زمانہ ہے، معاشرتی اور ثقافتی سطح پر اس قدر تبدیلیاں رونما ہوئیں کہ پلٹ کر دیکھیں تو ہزاروں برس کا فاصلہ محسوس ہوتا ہے، مگر غالب آج ہمارے درمیان ایک زندہ شخصیت کے طور پر موجود ہے۔ شہزاد احمد نے غالب کے بارے میں ایک پورا مضمون ''غالبِ خستہ کے بغیر''اور''غالب زندہ ہے''(''اوراق'' کے مستقل گوشہ ''سوال یہ ہے'' میں کی جانے والی بحث) لکھا ہے۔ اس مضمون میں غالب کے سائنسی شعور اور غالب کا اپنے عہد سے مختلف ہونا، غالب کا ولی کی روایت کو عروج بخشنا، ایرانی شاعری کی تہذیب کی پاسداری، نظیرا کبرآبادی اور غالب کی مماثلت، غالب کے موضوعات، مغربی ادب سے مماثلت، غالب اور اقبال کا ذہنی اشتراک، جیسے موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شہزاد احمد نے غالب کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میرے نزدیک غالب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اُنھوں نے کلاسیکی روایت کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا ہے اور اس طرح وہ ایک ادبی مکتبِ فکر، طرزِ احساس اور معاشرے کے عظیم ترین نمائندے قرار پائے۔ اس حد تک کہ اُن کے بعد حالی جیسے شعرا کو کلاسیکی انداز تجتے ہی بن پڑی۔''[۱۱]

غالب کے بعد شہزاد احمد کے ہاں ظفراقبال کی لسانیات پر بھی کچھ افکار ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک باقاعدہ مضمون ''بازار بھی ایک راستہ ہے'' ملتا ہے اور کچھ نوٹس ہیں جو دیگر مضامین میں دورانِ گفت گو وہ پیش کرتے ہیں۔ شہزاد احمد کا ظفراقبال کے بارے میں بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ظفراقبال مکمل طور پر شاعری میں ڈوبا ہوا شخص ہے جسے شاعری کے علاوہ اور کچھ پڑھنا بھی پسند نہیں، تخلیقی سطح پر ظفراقبال میں شعر کہنے کا بہت حوصلہ ہے، مگر وہ ظفراقبال کی لفظی چھیڑ چھاڑ کو پسند معنوی تبدیلی سے معتبر قرار نہیں دیتے۔ شہزاد احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شاعری کے بنیادی سوالات میں تبدیلی لائی جائے تاکہ غزل کے معنوی امکانات اور وسیع ہوں۔

صرف یہ فرض کر لینا کہ ایک شخص نئی زبان بنا سکتا ہے یہ رویہ انتہا کی انفرادیت پسندی ہے صرف۔ اس طرح کے تجربات تو غزل کی رویات میں پہلے سے بھی موجود تھے جہاں سے غزل کی تہذیب نے گھٹن محسوس کی۔ ایک رائے ملاحظہ فرمائیں:

> ''غزل کے اندر جو ردِ عمل پیدا ہو چکا تھا وہ تیزی سے روایت شکنی کی طرف آمادہ تھا اور اس کی انتہا اس وقت آئی جب لسانی تشکیل کے تحت خود غزل کے اندر توڑ پھوڑ کرنے کی کوشش کی گئی، اس سلسلے میں نمایاں نام ظفر اقبال کا ہے، جنھوں نے نہ صرف لفظیات کے ساتھ کھل کھیلنے کی کوشش کی بلکہ غزل کے تہذیبی رویے پر کاری ضرب لگائی مگر اُن کی یہ کوشش نیم دلانہ ہی نہیں نیم سنجیدہ بھی تھی، ''گلافتاب'' کی اشاعت کے وقت چند شائع شدہ غزلوں میں لفظی توڑ پھوڑ کر کے انہیں اس مجموعے میں شامل کیا گیا، اس وقت موقف یہ اختیار کیا گیا تھا کہ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ پرانی اور مروج زبان میں ادا نہیں کیا سکتا، مگر حالت یہ تھی کہ جو مضمون باندھے گئے تھے اُن میں زندگی کے بارے میں کوئی نئی جہت موجود نہ تھی بلکہ یہ اُن رویّوں کی بازگشت تھی جو پہلے بھی مزاحیہ یا نیم سنجیدہ غزل میں موجود تھے مگر باوجوہ راہ نہ پا سکے تھے۔''[۱۲]

ایک اور جگہ شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> ''ظفر اقبال کے لیے معانی سے زیادہ لسانی تخلیقیت اہم ہو گئی تھی۔''[۱۳]

ان تنقیدی آرا کے باوجود شہزاد احمد ظفر اقبال کو بہت پسند کرتے ہیں کہ ظفر اقبال کے ہاں شعر کہنے کا بہت جذبہ ہے اور غزل کے لفظی اور معنوی رشتے میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہتے کہ اُس کی شاعری بیل کے دو سینگوں پر کھڑی ہے اب پتہ نہیں کہ انھیں کون سا سینگ پسند ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُسے دونوں سینگ پسند نہ ہوں یہ دونوں سینگ روایت اور امکان کے ہیں۔ ایک مضمون میں ظفر اقبال کے بارے میں بڑی اہم بات کی ہے:

''اُسے اپنے خلاف باتیں کرنے کا چسکا ہے، روایتی طور پر تو شعرا تعلی کی طرف راغب رہے ہیں، مگر ظفر اقبال کے ہاں رد تعلی کا رویہ موجود ہے۔ وہ اپنے آپ کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کرتا ہے، جیسے بچے اپنی ہی تصویر پر مونچھیں اور داڑھی لگا دیتے ہیں۔''[۱۴]

شہزاد احمد مجموعی طور پر شاعری کے حق میں ہیں اُن کا خیال ہے کہ شاعری اُس وقت بھی نہیں ہو سکتی جب آپ کسی شے کو مکمل طور پر جانتے ہوں اور اُس وقت بھی نہیں ہو سکتی جب آپ کسی شے کو مکمل طور پر نہ جانتے ہوں لہٰذا یہ تمام عمل جاننے اور نہ جاننے کے درمیان ہے اور یہ رہتی دنیا تک رہے گا۔ اس کے بعد وہ غزل کے موجودہ امکانات سے بھی پُرامید ہیں۔ غزل اپنے خلاف ہونے والی تمام سازشوں کا جواب اپنے باطن میں چھپائے ہوئے ہے اپنی ثقافت اور تہذیب کی بنا پر زندہ رہنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ غزل ہر موضوع اور ہر لہجے کو اپنے اندر سمونے کے باوجود اجنبی محسوس نہیں ہوتی۔ آج کی غزل نفسیاتی، جنسی، سیاسی، طبقاتی اور سماجی عوامل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جہاں جدید غزل کا آغاز مواد کی تبدیلی سے ہوا تھا نا کہ غزل کو ختم کرنے سے۔ غزل بہت سارے معاملات میں اپنی ہیئت کے حوالے سے متعین صنف ہے۔ شہزاد احمد کی ایک رائے دیکھیں:

''جدید غزل کا آغاز اگرچہ ''انکار'' سے ہوا تھا، مگر یہ غزل کے مردہ مواد (Dead Matter) سے انکار تھا، غزل کی گلو خلاصی کرانے کی کوشش نہیں تھی۔''[۱۵]

جدید غزل کی ہیئت کو توڑنے کو جو کوشش بھی کی گئی وہ کامیاب نہ ہوئی بلکہ شہزاد احمد کے بقول اسے ہائیکو جتنی شہرت بھی نصیب نہ ہوئی۔ غزل اپنی ایک مکمل ثقافت اور تہذیب رکھتی ہے جس نے اپنے خلاف ہونے والے ہر ردِ عمل کو اپنے اندر سمویا ہے اور اپنی روایت میں بھی شامل کیا۔ شہزاد احمد کے ہاں روایتی اور جدید غزل کے فرق پر بھی بات کی گئی ہے۔ جدید غزل اور روایتی غزل کے بارے میں اُن کا نقطہ نظر الفاظ کے استعمال پر ہے کہ الفاظ صورتِ حال سے کیا رشتہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن کی ایک رائے بہت اہم ہے:

''روایتی غزل اور جدید غزل میں بنیادی فرق شاید یہی ہے کہ شاید روایتی غزل میں معاشرے کو اہمیت حاصل ہے اور تخلیق کاری کے عمل میں مبتلا ہر شخص معاشرے کے ساتھ تھوڑی بہت آویزش کے باوجود اس کے تعینات کو قبول کرتا ہے، مگر جدید غزل میں

فرد کے مسائل معاشرے کے مسائل سے جداگانہ ہو گئے ہیں،اس دوران جو فلسفے تشکیل دیے گئے ہیں وہ بھی فرد کے المیے کو بیان کرتے ہیں۔''[۱۶]

شہزاداحمد کی غزل پر تنقید کے دورجان بہت واضح ہیں ایک تووہ جدید غزل کی تاریخ تقسیم کے بعد تصور کرتے ہیں اور دوسرااُن کے تنقیدی شعور میں دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کے اثرات بہت واضح ہیں یہاں پراُن کا سائنسی شعور بھی جھنجھلااُٹھتا ہے۔دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا ایک نئے دور میں شامل ہوئی ہے یہاں پر سائنسی ترقی اوراخلاقی پستی دونوں اپنی انتہا پر تھیں سائنس اورادب کی بحثیں شروع ہوئیں۔ شہزاداحمد کے کئی مضامین میں دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریوں کاذکر موجود ہے۔

اُن کی نثری تحریروں کی ایک واضح جہت یہ بھی نکلتی ہے کہ اُنھوں نے کچھ مضامین ایسے بھی لکھے ہیں جن میں اردوزبان کی اہمیت وافادیت اور مسائل کاذکر کیا ہے۔ایسی تحریروں میں ''اردوزبان کے مسائل اور مستقبل''،اردواور جدیدعلوم'' شامل ہیں۔شہزاداحمد کثیر المطالعہ شخصیت تھے لہٰذا کئی باراُنھوں نے شاعری سے ہٹ کر بھی اردوزبان کی فکری بنیادوں اور ترویج واشاعت کے مسائل پر بات کی ہے۔وہ مجلس ترقی ادب لاہور کے منتظم بھی رہے ہیں جہاں اُنھوں نے اردوزبان کے اشاعتی مسائل کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہزاداحمد کو شاعری کے ساتھ ساتھ نثر سے بھی اتنی ہی رغبت تھی۔اُن کاخیال ہے کہ اگراردوزبان معدوم ہونے والی زبانوں میں سرِ فہرست نہ بھی ہو توکم از کم ہم اسے محفوظ زبان نہیں کہہ سکتے۔اس کی بقاء کے لیے ہمیں بہت اقدامات اُٹھانے ہوں گے۔اردوزبان کی بقاء کی ذمہ داری صرف ادب پر ہی نہ ڈالی جائے بلکہ اس کے دائرۂ اثر کو دیگرعلوم کے ساتھ جوڑا جائے جاگیردارانہ نظام کے تسلط سے نکل کر ہمیں جدید سائنسی معاشرہ کو تمام تر خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرنا ہوگا۔شہزاداحمد کی ایک رائے ملاحظہ فرمائیں:

''یہ حقیقت بھی اپنے طور پر موجود ہے کہ کوئی بھی زبان محض اپنے ادب پر زندہ نہیں رہ سکتی،ضروری ہے کہ اس کا تعلق علوم کے ساتھ بھی ہو اور روٹی کمانے کے وسائل کے ساتھ بھی،اور اردو کا یہی حصہ بہت کمزور ہے۔''[۱۷]

وہ ایک مضمون میں رسل کے اس اعتراض کو قبول کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے زبان کے معاملے میں مواد تو اکھٹا کر لیا مگر وہ کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکال سکے۔انھیں اس بات کو مکمل اعتراف ہے کہ ہمیں آئندہ زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے انگریزی زبان سے مدد لینا ہو گی۔ ہم اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک سائنس کو اپنی زبان میں متعارف نہ کروائیں بلکہ مقامی زبانوں میں بھی سائنسی اصطلاحات کو متعارف کرانا ہو گا۔

جو سرکاری ادارے محض اس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے کہ وہ اردو زبان کی ترویج واشاعت کے لیے کام کریں شہزاد احمد نے عامر بن علی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں ان تحفظات کا اظہار کیا ہے کہ وہ ادارے اردو زبان کے نفاذ میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہے اور حکومت بھی اس معاملے میں خاموش ہے نہ وہ اردو زبان کے نفاذ میں کوئی پیش رفت سامنے لا رہی ہے اور نہ ہی ان اداروں کو ختم کیا جا رہا ہے گورنمنٹ کا پیسہ بس ضائع کیا جا رہا ہے۔

شہزاد احمد نے کچھ نثری تحریریں ایسی بھی لکھی ہیں جن میں شخصی تاثرات بہت واضح ہیں اور یہ مضامین عموماً اپنے ہم عصروں پر لکھے گئے ہیں جن میں امجد اسلام امجد، قتیل شفائی، منیر نیازی، کشور ناہید، احمد فراز، پیرزادہ قاسم، صفیہ بھابی (منٹو کی بیوی)، خالد احمد، اظہار شاہین، اکبر حمیدی، شکیب جلالی، ظفر اقبال، سلیم آغا قزلباش جیسے لوگ شامل ہیں۔ شہزاد احمد دوستوں کے ضمن میں بہت بے تکلف تھے اور مزاح میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اُن کی تمام زندگی لاہور میں ہی گزری ہے کچھ چھوٹے چھوٹے سفر ہیں دیگر شہروں کے جن میں خوشاب، سرگودھا، کراچی، اور اسلام آباد شامل ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارنے پر وہ لاہور کے چھوٹے بڑے ادبی حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے کئی محافل میں شامل ہو کر وہ جونیئرز شعرا کی حوصلہ افزائی میں پیش پیش رہتے تھے اور یوں وہ خود میں نئے نئے مضامین کی تلاش میں رہتے تھے۔ اپنے ہم عصروں کے ضمن میں کچھ جملے ایسے ہیں جو خاص مقام رکھتے ہیں، مثلاً کشور ناہید کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''چناں چہ کشور کے شعر پڑھتے ہوئے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں چولہے کے پاس بیٹھا ہوں اور میرے ارد گرد کی فضا میں گھر کی خوشبو رچی بسی ہے۔''[۱۸]

قتیل شفائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کے موضوعات بھی ایک خاص مزاج کے ہیں جن میں کلاسیکل طرزِ اظہار کی جھلک ہمیشہ نمایاں رہتی ہے۔ قتیل شفائی مزاج کے لحاظ سے کلاسیکی غنائی انداز کے شاعر ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اُن کا رشتہ لمحہ موجود کے ساتھ بہت گہرا ہے۔''[۱۹]

امجد اسلام امجد کے بارے میں ایک مضمون میں لکھتے ہی:

''امجد اسلام امجد کو بنیادی طور پر ایک رومانی شاعر ہی کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس کا مرکزی مسئلہ محبت ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ محبت کا ایک روپ نہیں کئی روپ بیان کرتا ہے۔ محبت اُس کے نزدیک بیک وقت اُجاڑ دینے والی اور برباد کر دینے والی شے ہے۔''[۲۰]

شہزاد احمد لاہور جیسے مرکزی شہر میں رہ کر بھی خود کو کسی مخصوص جماعت سے گروپ کے لیے وقف نہیں کیا بلکہ اُن کا تعلق صرف اور صرف ادب، سائنس، فلسفہ اور نفسیات سے رہا ہے۔ جہاں وہ بہت سے معاصرین کے بارے میں مثبت رائے رکھتے ہیں وہاں پر اُنھیں اگر کسی جگہ پر کوئی خامی نظر آئے تو بلاخوف و خطر منہ پہ آئی بات کہہ دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا دو گروپوں میں تقسیم تھے اور اس ضمن میں تنویر ظہور کا انٹرویو ''شہزاد احمد سے مکالمہ'' بہت اہم ہے۔ اس انٹرویو میں شہزاد احمد نے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے شعری خصائص تو بیان کر دیے مگر واضح طور پر کسی شخصیت کی طرف جھکاوَ پیش نہیں کیا۔ ایک مقام پر وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی سے اُن کی ملاقات پہلے کی ہے اور نیاز مندی کا رشتہ بھی ہے، دوسری طرف ڈاکٹر وزیر آغا سے متاثر ہونے کا بھی بتاتے ہیں، ایک رائے ملاحظہ فرمائیں:

''میں ایک حقیر سا شخص ہوں، میرا کسی گروپ سے تعلق نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہر شخص کو انفرادی طور پر اپنا مقام بنانا چاہیے۔''[۲۱]

صغریٰ صدف کو دیے گئے انٹرویو ''شہزاد احمد سے مکالمہ'' میں وہ دبستان لکھنوَ اور دبستانِ دہلی سے بھی انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بہت ڈھیلی ڈھالی اصطلاح ہے میں اسے تسلیم نہیں کرتا چاہے لسانی، تخلیق

اور فکری سطح پر دونوں گروپ کتنے ہی فاصلے پر ہوں۔ اب کچھ انٹرویوز میں وہ اپنے معاصرین کے بارے میں یوں بھی کہہ دیتے ہیں:

''جب کہ منیر نیازی مزاجاً شاعر ہیں، کبھی اُن پر انسا پریشن کا لمحہ آجائے تو شعر کہہ لیتے ہیں لیکن شاعری میں اُن کا ویژن محدود اور Content اور کرافٹ کمزور ہے۔''[۲۲]

اسی انٹرویو میں شہزاد احمد ادبی دھڑے بازیوں اور گروپوں کی تقسیم کے بارے میں ایک اہم رائے دیتے ہیں:

''میں ادب میں گروہ بندی کے ذریعے آگے آنے اور دوسروں پر قلمی حملے کے خلاف ہوں۔ پہلے ادیب ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ قلمی لڑائی کا یہ کھلا انداز انتظار حسین نے اپنے کالموں سے شروع کیا تھا۔ میں کہتا ہوں آج بھی اگر اخبارات کے ادبی صفحات بند ہو جائیں تو ادیبوں کے درمیان لڑائی ختم ہو سکتی ہے۔''[۲۳]

ان حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزاد احمد کا تنقیدی شعور ایک سمت میں بہہ جانے کا قائل نہیں بلکہ وہ ہر طرح کی بات اپنے اظہار میں شامل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

شہزاد احمد کی نثری تحریریوں میں ایک خاص جہت یہ بھی شامل رہی ہے کہ وہ ایک نفسیات، فلسفہ اور سائنسی علوم سے دلچسپی رکھنے والے شاعر ہیں۔ اس بابت اُن کی تحریریوں میں فلسفہ، نفسیات اور سائنس کی گفت گو کئی مقامات پر سامنے آتی ہے۔ کئی ادبی نشستوں اور ادبی محافل میں اُن سے سائنس اور شاعری کی بابت سوالات کیے گئے ہیں۔ اُنھوں نے بڑی مدلل دلیلوں سے سائنس اور شاعری کی حدود پر گفت کی ہے۔ شہزاد احمد نے ۱۹۵۲ء میں ایم۔ اے نفسیات کیا اور پھر ۱۹۵۵ء میں ایم۔ اے فلسفہ کیا۔ یہ دونوں مضمون اُس زمانے میں ایک خاص اہمیت رکھتے تھے۔ لہٰذا اُن کی طبیعت میں سائنس کی طرف ایک خاص قسم کا لگاؤ پیدا ہو گیا جسے بعد میں تمام عمر اپنایا گیا۔ شہزاد احمد تنویر ظہور کو دیے گئے ایک انٹرویو میں سائنسی مضامین کی بابت بتاتے ہیں کہ پاکستان میں سائنسی مضامین لکھنے کی ابتدا ہی میں نے کی تھی۔ ''مذہب، تہذیب، موت (فرائیڈ کا نظریۂ جبلت مرگ کا مطالعہ اور اطلاق)'' شہزاد احمد کی پہلی کتاب ۱۹۶۲ء میں مکتبہ کارواں لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔

مغربی ادب سے متاثر ہونا بھی شہزاد احمد کے ہاں بہت عام ہے وہ جگہ جگہ مغربی ادب اور مغربی سائنس دانوں کی مثالیں دیتے ہیں۔ایک انٹرویو میں وہ کہتے ہیں:

> ''یہاں مجھے تسلیم کرنا ہے کہ میں شعوری یا غیر شعوری کوشش سے کوئی روش نہیں بنائی۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں تین اہم موضوع ہوا کرتے تھے۔ کارل مارکس، فرائیڈ، آئن سٹائن۔''[۲۴]

اسی باعث یہ موضوعات تمام عمر شہزاد احمد کے مزاج کا حصہ بن گئے اور تمام عمر اُنھوں نے مختلف چیزوں کو انھیں نظریات کی عینک سے دیکھا سمجھا اور لکھا۔ شہزاد احمد کے سائنسی شعور اور مغربی ادب سے متاثر ہونے کے بارے میں مزید استفادہ کرنا ہو تو ایک بحث جسے تنویر ظہور نے مرتب کیا اس میں فوزیہ سلیمی کو بطور سائنس دان اور شہزاد احمد کو بطور شاعر اکھٹا کیا گیا۔ یہ بحث روز نامہ جنگ ۴تا۱۰، اپریل ۱۹۸۶ء کو شائع ہوئی جو کہ بہت اہم ہے۔اس بحث میں شہزاد احمد نے شاعری کو سائنس سے افضل ثابت کیا ہے۔ کیوں کی وہ شعور جس پر سائنس چیزیں ایجاد کرتی ہے وہ شاعروں اور صوفیا کے پاس ہے۔اس کے علاوہ ایک بحث ڈاکٹر تحسین فراقی اور شہزاد احمد کے درمیان ''چہرہ بہ چہرہ، رُو بہ رُو'' کے عنوان سے شائع ہوئی وہ بھی بہت اہم ہے۔ شہزاد احمد نے اپنی نثری تحریروں میں جن جن مغربی شخصیات کا ذکر کیا ہے اُن کے نام یہ ہیں۔

آرتھر کوسلر، آئزک ایسی موف، لولیتا والے بوکوف، رسل، کیپلر، نیوٹن، ڈارون، ویلس، سپنسر، اڈلر، فرائیڈ، سارتر، ژونگ، ٹی ایس ایلیٹ، ایلون ٹافر، گرڈجیف، پسپیز، ہیکلن، کولن ولسن، راجر سپیری، ہرمن ہیسے، ڈیل کارہنگی، لینین، گورکی، ماؤزے تنگ، لوھسوں، ارشمیدس، زلارڈ، اس کے علاوہ اُنھوں نے جن جن مغربی ادب سے مغربی ادبی تھیوریوں کا ذکر کیا ہے ان میں۔

''تجاذب(Gravity) کا نظریہ'' کیپلر کے تیس آسمانی اصولوں کی بنیاد۔ فرائیڈ اور اس کے مکتبِ فکر نے اس ''میں'' کے لیے ایغو(Ego) کی اصطلاح۔ ژونگ کی اصطلاح میں اسے ظاہر بریں(Extrovert) کوانٹم نظریہ۔ بقول فرائیڈ جبرِ اعادہ(Repetition Compulsion) شامل ہیں۔ بہت سے مقامات پر تو وہ کئی مغربی نقادوں کے معروف جملے جو اُن کی تقریروں کا حصہ ہوتے ہیں کوڈ کر دیتے ہیں۔ شہزاد احمد کے ہاں سائنسی

علوم، مغربی ادب ایک بہت بڑا(source of inspiration) ہے۔ وہ تمام عمر فکری سطح پر اسی وجہ سے زندہ رہے کہ وہ وسیع المطالعہ تھے۔

شہزاد احمد کے انشائیے بھی اُن کی غیر مدون نثری تحریروں میں شامل ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے رسالہ ''اوراق'' سے ۱۹۸۵ء سے باقاعدہ انشائیہ لکھنا شروع کیا۔ ''اوراق'' کا شمارہ ۴، ۵ مئی ۱۹۸۵ء میں اُن کے دو انشائیے ''آہٹ'' اور ''گھوڑا اور میں'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اب تک اُنھوں نے گیارہ انشائیے لکھے ہیں، جو اُن کی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں بلکہ مختلف رسائل میں محفوظ ہیں۔ شہزاد احمد کے کمالِ مہارت کا یہ منہ بولتا ثبوت ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کسی بھی صنف میں کامیابی سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُنھوں نے اس صنف کو اس قدر مالا مال نہیں کیا جس قدر وہ غزل اور نظم کی طرف راغب رہے، شہزاد احمد کا انشائیہ کی طرف راغب ہونا یقیناً ڈاکٹر وزیر آغا کی صحبت کا اثر ہے۔ اس بارے میں انور سدید نے شہزاد احمد کی ایک گفتگو کو کوڈ کیا ہے ملاحظہ فرمائیں:

> ''کئی دنوں سے چند باتیں میرے ذہن میں گھوم رہی تھیں جو نہ غزل میں سماتیں اور نہ نظم میں راہ پاتیں۔ میں نے اُنھیں غیر رسمی انداز میں لکھ ڈالا۔ ان باتوں میں ڈاکٹر وزیر آغا کو شامل کیا تو وہ کھل اُٹھے کہنے لگے ''یہ تو مکمل انشائیہ ہیں'' خدا جانے یہ میرا عمل شعوری ہے یا غیر شعوری!''[۲۵]

شہزاد احمد کے انشائیوں کے نام۔ آہٹ، گھوڑا اور میں، معجزہ، ٹھہرا ہوا منظر، جلی ہوئی کشتیاں، نیند سے پہلے، ایک انجانا دن، ایک درخت، اماوس کی رات، ایک دروازہ، ایک سوال شامل ہیں۔ شہزاد احمد کے انشائیے بھی اُن کی دیگر نثری تحریروں کی طرح مغربی مطالعے اور سائنسی نقطہ نظر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ انشائیوں کی یہ فضا لطیف اسلوب کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر حُسن، فطرت، خود کلامی، مادیت، بے حسی، مشینی دور کا روگ، انسان کا سائنسی ایجادات میں کھو جانا، عدم تحفظ، لاحاصلگی، خوف، سائنس اور تاریخ، انسان کا ارتقاء، واہمات، انسان کا اپنے ہونے کا جواز، جیسے عوامل کا تاثر پیدا کرتی ہے۔

یہ اسلوب بھید بھرا اسلوب ہے جس میں وہ لاشعوری طور پر کبھی اپنے ہم نواؤں کو مخاطب کرتے ہیں تو کبھی خود اپنی ذات میں سمٹ آتے ہیں اور اپنے آپ سے سوال بھی اس انداز میں کرتے ہیں کہ ہم سب اندر راندر سے کتنے لگتے ہیں کہ یہ بات اجتماع کی ہے مگر متن میں بات کرنے والا تو خود سے مخاطب ہے۔ ایک اقتباس دیکھیں:

> ''پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میرا سینہ خالی ہو گیا ہے اور لفظوں نے اپنے معانی کھو دیے ہیں۔ میں اس آگ کی طرف واپس آیا جو اب راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی، مگر چاند وہاں نہیں تھا شاید وہ جل بجھ کر خاکستر ہو چکا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے، اور اپنی لاکھ برس کی طویل زندگی میں میں شاید پہلی بار کھل کر رویا تھا، پھر روتے روتے مجھے نیند آگئی اور میں اسی راکھ پر دراز ہو گیا جسے کچھ دیر پہلے میں نے جلتے اور تڑختے دیکھا تھا۔''[۲۶]

اس اقتباس میں شہزاد احمد نے لاکھوں برس کی طویل عمر کا لفظ استعمال کر کے بات کو ذات سے نکال کا اجتماع میں شامل کر دیا ہے اور ہم سب اچانک انسانی ارتقاء کی طرف سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔

شہزاد احمد جہاں سائنس، نفسیات اور فلسفہ کے طالب علم رہے وہاں وہ انشائیوں میں سائنسی ایجادات کو اس کائنات کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں بطور خاص دوسری جنگِ عظیم میں انسانیت کو جو صدمہ پہنچا اُس سے سائنسی ترقی پر سے اُن کو خوف سا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس برق رفتاری سے بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی سے عدم تحفظ اور لاحاصلی محسوس کرتے ہیں۔ انشائیوں میں فطرت سے شناسائی جنگلوں میں کسی آواز کا آنا، گھوڑا اور مخلوق الفطرت اشیا کو بطور کردار پیش کرنا بنیادی طور پر فطرت کو باور کروانے کے مترادف ہے۔

شہزاد احمد کی غیر مدون نثری تحریروں میں چند نتائج سامنے آتے ہیں جن میں پہلی بات تو یہ کہ وہ نثر میں مغربی ادب، مغربی ادبی تھیوریوں اور نظریات کا بہت استعمال کرتے ہیں۔ جدید غزل کا قیام اُن کے نزدیک قیام پاکستان کے بعد ہے۔ دوسری جنگِ عظیم نے فکرِ شہزاد احمد کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ غالب، اقبال، یگانہ، حالی، نظیر اکبر آبادی اور ظفر اقبال نے غزل کی مجموعی فضا میں شہزاد احمد کو متاثر کیا ہے۔ پاکستان پہلی بار میں سائنسی مضامین لکھنے کا دعویٰ بھی شہزاد احمد کرتے ہیں۔ جدید غزل کے بارے میں وہ ایک دعویٰ تنویر ظہور

والے انٹرویو میں کرتے ہیں: ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس چیز کو جدید غزل کہا جاتا ہے اُس کا آغاز میں نے کیا۔ آج جن موضوعات پر جدید غزل لکھی جا رہی ہے وہ موضوعات وہی ہیں جو ابتدا میں میں نے پیش کیے تھے۔'' ایک اور اہم نتیجہ یہ بھی ہے کہ شہزاد احمد کا اپنا شمار کس تحریک میں کیا جا سکتا ہے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ شہزاد احمد ترقی پسند تھے کیوں کا اُن کا کالج کا زمانہ وہ تھا جب ہر طرف ترقی پسندی کا چرچا تھا، نوجوانوں کے موضوعات میں کارل مارکس، آئن سٹائن، فرائڈ جیسے لوگ شامل تھے۔ خود شہزاد احمد آئن سٹائن کو تقریباً بیس سال تک پڑھتے رہے مگر خود کو ترقی پسند تسلیم نہیں کرتے نہ اُن کے تخلیقی متن سے کوئی ایسی واضح جہت نکلتی ہے جس پر اُنھیں ترقی پسند کہا جا سکے۔ شہزاد احمد کا شمار نئی غزل میں کیا جا سکتا ہے جب ترقی پسند تحریک فکری سطح پر اپنا وجود کھو رہی تھی تو دوسری طرف غزل میں ایسی فکر جنم لے رہی تھی جسے آج ہم نئی شاعری یا نئی غزل کہہ سکتے ہیں۔ شہزاد احمد کا شمار بھی نئی غزل میں کیا سکتا ہے۔ جدید غزل نے اردو غزل کو فکری سطح پر جو رویہ بخشا ہے شہزاد احمد کی غزل انھیں بنیادی سوالوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ کوئی بھی تبدیلی لفظ کی سطح پر لانے کے قائل نہیں بلکہ فکر کی سطح پر تبدیلی کے حق میں تھے۔

حوالہ جات

۱۔ آصف نظیر، موج میں دریا (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۰۰ء)، ص ۱۲۔

۲۔ شہزاد احمد، ''غزل یا نظم'' (اداریہ)، مشمولہ: راوی (لاہور: گورنمنٹ کالج لاہور، شمارہ ۳، جلد ۲۴، مئی ۱۹۵۳ء)، ص ۲۔

۳۔ ایضاً، ص ۳:۲۔

۴۔ شہزاد احمد، ''اکبر حمیدی اور جدید غزل''، مشمولہ: اوراق (لاہور: سالنامہ، شمارہ ۲۱، جلد ۲۶، دسمبر ۱۹۹۱ء)، ص ۳۶۹۔

۵۔ شہزاد احمد، ''غزل اور رد غزل''، مشمولہ: فنون (لاہور: ماہنامہ، شمارہ ۲، ۳ جلد ۱۶، جنوری، فروری ۱۹۷۳ء)، ص ۲۸۔

۶۔ شہزاداحمد، (مرتب)، رنگِ غزل (آزادی کے بعد اردو غزل کا چالیس سالہ انتخاب) (لاہور: مجلس ترقی ادب، نومبر ۲۰۰۸ء)، ص۱۸۔

۷۔ شہزاد احمد، ''اردو زبان کے مسائل اور مستقبل''، مشمولہ: معاصر (لاہور: سہ ماہی، شمارہ ا، ۲، جلد ۲، جنوری تاجون ۲۰۰۲ء)، ص۵۰۔

۸۔ شہزاداحمد، ''اردو غزل کے جدید تر رجحانات''، مشمولہ: فنون (لاہور: سہ ماہی، شمارہ ا، ۲، جلد ۱۳، جون، جولائی ۱۹۷۱ء)، ص۱۳۔

۹۔ یہ انٹرویو ''شہزاداحمد سے مکالمہ'' کے عنوان سے روزنامہ ''جنگ'' میں شائع ہوا تھا۔ یہی انٹرویو بعد میں معمولی اضافے کے ساتھ تنویر ظہور کی کتاب ''دلچسپ ملاقاتیں'' میں بھی شائع ہوا ہے۔

۱۰۔ شہزاد احمد، ''غزل اور ردِ غزل''، مشمولہ: فنون (لاہور: ماہنامہ، شمارہ ۳، ۲، جلد ۱۶، جنوری، فروری ۱۹۷۳ء)، ص۲۸۔

۱۱۔ شہزاد احمد، ''غالب زندہ ہے'' (بحث)، مشمولہ: اوراق (غالب نمبر) (لاہور: سالنامہ، اپریل ۱۹۶۹ء)، ص۳۶۔

۱۲۔ شہزاداحمد، (مرتب)، رنگِ غزل (آزادی کے بعد اردو غزل کا چالیس سالہ انتخاب) (لاہور: مجلس ترقی ادب، نومبر ۲۰۰۸ء)، ص۱۶۔

۱۳۔ شہزاد احمد، ''غزل اور ردِ غزل''، مشمولہ: فنون (لاہور: ماہنامہ، شمارہ ۳، ۲، جلد ۱۶، جنوری، فروری ۱۹۷۳ء)، ص۲۷۔

۱۴۔ شہزاداحمد، ''بازار بھی ایک راستہ ہے''، مشمولہ: ظفر اقبال ایک عہد، ایک روایت، مرتبہ: ڈاکٹر سید عامر سہیل (لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، طبع اول ۲۰۱۸ء)، ص۱۵۹۔

۱۵۔ اظہار شاہین، دیوار میں در (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، جون ۱۹۹۱ء)، ص۱۸۔

۱۶۔ شہزاداحمد، ''درد کی زمینوں میں''، مشمولہ: چہار سو (پیر زادہ قاسم نمبر) (راولپنڈی: ماہنامہ، جلد ۲۳، نومبر، دسمبر ۲۰۱۴ء)، ص۴۵۔

۱۷۔ شہزاد احمد، ''اردو زبان کے مسائل اور مستقبل''، مشمولہ: معاصر (لاہور: سہ ماہی، شمارہ ۱، جلد ۲، جنوری تا جون ۲۰۰۲ء)، ص ۴۹۔

۱۸۔ شہزاد احمد، ''کشور ناہید''، مشمولہ: فنون (لاہور: شمارہ ۵،۴، جلد ۲، فروری مارچ ۱۹۶۶ء)، ص ۲۸۷۔

۱۹۔ شہزاد احمد، ''قتیل شفائی کی شاعری پس منظر''، مشمولہ: فن اور شخصیت (قتیل شفائی نمبر) (ممبئی: شمارہ ۱۳، ستمبر ۱۹۸۱ء تا مارچ ۱۹۸۲ء)، ص ۲۵۔

۲۰۔ شہزاد احمد، ''امجد کی شاعری محبت اور وقت کے آئینے میں''، مشمولہ: فنون (لاہور: ماہنامہ، شمارہ ۲۸، جون جولائی ۱۹۸۹ء)، ص ۹۸۔

۲۱۔ تنویر ظہور، شہزاد احمد، ''شہزاد احمد سے مکالمہ''، مشمولہ: دلچسپ ملاقاتیں (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء)، ص ۹۷۔

۲۲۔ ایوب ندیم، شہزاد احمد، ''انٹرویو''، مشمولہ: ہوئے ہم کلام (لاہور: گوہر پبلی کیشنز، اشاعت اول، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۰۲۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۲۰۳۔

۲۴۔ گلزار جاوید، شہزاد احمد، ''براہِ راست'' (انٹرویو)، مشمولہ: چہار سو (راولپنڈی: جلد ۱۸، جنوری، فروری ۲۰۰۹ء)، ص ۱۰۔

۲۵۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''شہزاد احمد کے انشائیے''، مشمولہ: مخزن ۲۴ (شہزاد احمد نمبر) (لاہور: قائدِ اعظم لائبریری، شمارہ ۲، جلد ۱۲، ۲۰۱۲ء)، ص ۶۵۔

۲۶۔ شہزاد احمد، ''معجزہ'' (انشائیہ)، مشمولہ: اوراق (لاہور: ماہنامہ، شمارہ ۹، ۱۰، جلد ۲۰، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء)، ص ۳۸۶۔